ڈاکٹر رؤف پاریکھ

الحاقی متون اور منسوبات کی تحقیق: داخلی اور خارجی شواہد

Researching pseudoepigrapha and misattribution: intrinsic and extrinsic evidence

ABSTRACT:

Pseudepigrapha, also known as pseudographia in literary research, are the texts whose apparent or generally known authors are not the actual authors. Such works are not always forged texts and sometmies works are unintentionally misattribted to some one other than the actual writer, albeit there have been cases of intentionally misattributed texts either to gain some worldly benefits or to influence the religious views of some specific sect.

In Urdu and Persian literatures, examples of both forged and intentionally or unintentionally misattributed works are not common but they are not rare either. This research paper mentions certain wrongly attributed as well as forged literary texts and expalins the ways and means of recognising such works. There are two basic ways of telling a forged or wrongly attributed literary text from the original one: intrinsic evidence and extrinsic evidence. Intrinsic evidence is whatever written in a specific text and extrinsic evidence consists of all other texts, books, historical works and writings by others. This paper discusses the nature of both kinds of evidence and explains what evidence was used in recognising dubious texts, giving examples from some well-known Urdu and Persian literary texts with reference to some renowned researchers of Urdu. It also analyses the nature of evidence found in some of the research works that have unearthed some of the misttribued texts, pseudoepigraphic works, forged texts and plagiarised tetxs.

KEYWORDS:

pseudoepigrapha, misattributed texts, intirinsic evidence, extrincic evidence, literary forgeries.

شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے کہ امام شافعی کے منقبتی اشعار میں بعض ایسے الحاقی اشعار بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو امام صاحب کے مسلّمہ عقائد کے خلاف ہیں اور ان میں ایسے بزرگوں کے بھی نام آئے ہیں جو امام صاحب کے زمانے میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے[۱]۔اس طرح کے الحاقی متون میں شاہ نعمت اللہ ولی کے فارسی قصائد کو بھی شامل کیا جاتا ہے[۲] جن کی پیشین گوئیوں کا بڑا شہرہ ہے اور آج کل ان کے ایسے اردو ترجمے بھی گردش کر رہے ہیں جن میں مسلمانوں کے عروج کی نوید سنائی گئی ہے ،البتہ شاہ صاحب سے منسوب بعض قصیدوں کے اشعار میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے بعض واقعات کا ذکر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے کم از کم کچھ حصے ضرور الحاقی ہیں یا قصیدوں کے اردو مترجمین نے ان میں اضافہ کر دیا ہے کیونکہ شاہ نعمت اللہ ولی کا پندرھویں صدی عیسوی میں یعنی ۱۸۵۷ء سے کوئی ساڑھے تین سو یا چار سو سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

ادب کی دنیا میں اس طرح کا الحاق یا جعل کوئی نئی یا عجیب چیز نہیں ہے۔دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں جعلی متون یا اصل متن میں شامل کیے ہوئے اضافی متن (جسے الحاقی متن کہتے ہیں) اور دانستہ یا نادانستہ اصل مصنف کے بجاے کسی اور سے منسوب کیے ہوئے متون (جنھیں منسوبات کہتے ہیں) کی مثالیں موجود ہیں۔فارسی میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن پر تحقیق کے بعد آشکار ہوا کہ اس کا اصل مصنف کوئی اور تھا اور اسے دانستہ یا نادانستہ طور پر کسی اور سے منسوب کر دیا گیا تھا۔اردو ادب میں ایسے متون عام تو نہیں ہیں لیکن ایسی مثالوں کی کوئی کمی بھی نہیں ہے۔البتہ یہ ضرور ہے کہ تمام منسوبات بدنیتی کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات تحقیق کے فقدان اور سنی سنائی روایات پر اعتبار کر لینے سے بعض متون اصل مصنف کے بجاے کسی اور سے منسوب ہو جاتے ہیں۔اسی طرح بعض اوقات اصل متن میں الحاقی عناصر نادانستہ طور پر شامل ہو جاتے ہیں اور صدیوں تک انھیں مستند سمجھا جاتا ہے تاوقتے کہ کوئی محقق داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دیتا ہے۔

اس مقالے میں ہم ادبی متون کے ضمن میں ایسے متون کا ذکر کریں گے جو بعض اَسقام کی وجہ سے درجۂ اعتبار سے ساقط ہوتے ہیں اور محققین کو ان سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے یا ان کے حوالے دیتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے، مثلاً سنی سنائی یا غیر معتبر روایات پر مبنی متن، الحاقی متن، جعلی متن، منسوبات اور مجہول الاحوال متن نیز غیر مستند مآخذ اور غیر معتبر راویوں کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے جن کے تحقیقی کاموں میں حوالے دیتے ہوئے

احتیاط کرنی چاہیے۔ اس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو اور فارسی ادب کے مرتّبہ متون اور تدوینِ متن کی کاوشوں نیز تحقیقی کاموں سے مثالیں پیش کر کے وضاحت کی جائے اور دیکھا جائے کہ داخلی اور خارجی شواہد کی مدد سے کیسے مشکوک اور غیر معتبر متون کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

اِلحاق، جعل اور منسوبات: وجوہات

مشکوک یا غیر معتبر متون کے رواج پاجانے کی ایک وجہ تحقیق، تدقیق اور تنقیح کی کمی ہے۔ انسان طبعاً اپنی رائے سے مطابقت رکھنے والی باتوں کو بغیر چھان بین کے بھی قبول کرلیتا ہے اور روایات کو حقائق یا حالات کے تقاضوں کے مطابق جانچنے کی کوشش نہیں کرتا[۳]۔ بعض لکھنے والے بزرگانِ دین کے نام پر کتابیں تصنیف کر کے پھیلادیتے ہیں اور ان کا مقصد کسی خاص فرقے کے نظریات کا فروغ یا بعض مذہبی مسائل پر عام آرا میں تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے[۴]۔ اس کی ایک مثال فریدالدین عطار سے منسوب کتاب مظہر العجائب ہے جو کسی اور شخص نے لکھ کر عطار سے منسوب کردی تاکہ انھیں کسی اور فرقے کا پیرو کار ثابت کیا جاسکے[۵]۔ ایک اور صورت التباس اور مغالطہ بھی ہے جس میں دو شخصوں کے ہم نام ہونے کی وجہ سے یا بعض اوقات محض اتفاق سے کسی ایک کا کلام کسی دوسرے کے نام منسوب ہو جاتا ہے اور عقیدت وسلف پرستی کی وجہ سے بھی الحاق کی صورت پیش آتی ہے، جیسا کہ حضرت خواجہ معین الدینؒ کے دیوان کے سلسلے میں ہوا جو درحقیقت ان کا نہیں تھا[۶] (اس کا ذکر آگے آرہا ہے)۔ بعض اوقات ناشرین بھی لاعلمی کے سبب (یا مالی منفعت کے خیال سے) ادبی دنیا میں شہرت یافتہ یا مذہبی طور پر محترم ومقدس ہستیوں کے نام سے بعض متون چھاپ دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے منسوب ایک فارسی دیوان ہے جو نول کشور نے شائع کیا تھا۔ غلام مصطفی خاں صاحب نے اس کی پانچویں اشاعت (کان پور، ۱۸۸۳ء) کا جائزہ لے کر دلائل سے ثابت کیا کہ یہ دیوان حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کا نہیں ہو سکتا[۷]۔

اِلحاقی متن

اِلحاق کے لفظی معنی ہیں ملا ہوا ہونے کی حالت، ملحق ہونے کی کیفیت اور الحاقی یعنی ملحق، ملا ہوا[۸] نیز اضافہ کیا ہوا، بڑھایا ہوا[۹]۔ کسی کی تخلیق میں کسی اور کی تخلیق شامل ہو جائے تو اسے الحاق کہتے ہیں[۱۰]۔ گویا الحاقی متن وہ عبارت ہے جو اصل متن میں موجود نہ ہو اور اسے بعد میں بڑھایا گیا ہو، جیسے امیر خسرو کی اردو یا ہندوی شاعری کے بعض نمونے بڑے اعتماد سے بار بار ادبی تنقید میں پیش کیے جاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے شاید ہی کوئی امیر خسرو کی تخلیق ہو اور اگر ہو بھی تو الحاقی عناصر سے خالی نہیں ہو گی۔ امیر خسرو نے اردو (یا

ہندی یا ہندوی) میں شاعری ضرور کی ہے اور اس کا ثبوت بھی ملتا ہے[۱۱]۔ لیکن امیر خسرو نے اپنا اردو یا ہندوی کلام کبھی جمع نہیں کیا[۱۲]، بلکہ ان کو کبھی جمع کرنے کا خیال بھی نہیں کیا کیونکہ وہ اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے[۱۳]۔ ان سے منسوب اردو کلام کا بیشتر متن مشکوک ہے، خاص کر خسرو سے منسوب پہیلیوں، کہہ مکرنیوں، ڈھکوسلوں اور دوسخنوں کا متن سب سے زیادہ متنازع فیہ ہے اور ان کی بعض پہیلیوں میں ایسی اشیاء کا ذکر بھی ملتا ہے جو اس زمانے تک ایجاد ہی نہیں ہوئی تھیں، مثلاً بندوق[۱۴]۔ ان میں سے بعض پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں وغیرہ کی زبان اتنی صاف ہے کہ اسے آج سے تقریباً سات سو ساڑھے سات سو سال پہلے کی اردو نہیں کہا جا سکتا۔ چونکہ خسرو کا کلام صدیوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آیا اور لوگ اس میں اضافے کرتے گئے، گویا اس میں الحاق ہوتا گیا نیز خسرو کے اس کلام کا کوئی قدیم نسخہ بھی نہیں ملتا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ خسرو کے اردو یا ہندی کلام کے کسی بھی حصے کو سو فی صدی ان کا کلام نہیں مانا جا سکتا[۱۵]۔

گوپی چند نارنگ نے اشپرنگر کے ذخیرے میں شامل جس نسخے سے امیر خسرو کا کلام پیش کیا ہے[۱۶] وہ بھی کوئی بہت قدیم نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سال پرانا ہے جبکہ امیر خسرو کے انتقال کو لگ بھگ سات سو سال ہو چکے ہیں۔ گویا یہ نسخہ امیر خسرو کی وفات (۱۳۲۵ء) کے کوئی چار سو یا ساڑھے چار سو سال بعد وجود میں آیا۔ مصنف کی وفات کے اتنے طویل عرصے بعد کتابت کیا گیا نسخہ کس حد تک مستند ہو سکتا ہے اور اس میں کتنا الحاقی متن شامل ہو سکتا ہے اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ اس کتاب کو پیش کرنے سے نارنگ صاحب کا ایک بڑا مقصد ہندی، ہندوی کی قدامت اور تفوق کو ثابت کرنا تھا لیکن ظاہر ہے کہ قریب العہد نسخوں یا معاصر شواہد کی عدم موجودگی میں یہ مقدمہ کم زور ہی رہا۔ امیر خسرو کے دوہوں کا کچھ متن جس قدیم ترین ماخذ میں ملتا ہے وہ ملا وجہی کی سب رس ہے جو ۱۶۳۵ء میں مکمل ہوئی، گویا امیر خسرو کی وفات کے کوئی تین سو سال بعد، لیکن حنیف نقوی کی رائے ہے کہ ملا وجہی کی یہ روایت کسی بھی درجے میں قابلِ قبول نہیں کیونکہ اس میں طویل بُعدِ زمانی ہے[۱۷]۔ سوال یہ ہے کہ جب ۱۶۳۵ء کی کوئی روایت امیر خسرو کے کلام کے لیے ناقابلِ قبول ہے تو اس کے بعد کے دور میں پیش کیے گئے اشپرنگر کے ذخیرے کے کسی مخطوطے کو کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے؟

منسوبات

منسوبات جمع ہے منسوبہ کی اور منسوب، منسوبہ کا مطلب ہے منسوب کیا گیا، منسوب کی گئی، جس سے نسبت ہو نیز تعلق رکھنے والا یا والی، متعلقہ، اور اردو میں منسوبہ مراداً منگیتر کو بھی کہتے ہیں ۱۸۔ انتساب کے ایک معنی اپنی تصنیف کو کسی کے نام معنوَن کرنا بھی ہیں ۱۹۔ اس لفظ کے لغوی معنی لغات میں درج کر دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ تدوین و تحقیق کی اصطلاح بھی ہے۔ افسوس کہ اس کے اصطلاحی معنی اردو لغات میں نہیں ملتے اور ادبی و تنقیدی اصطلاحات کی فرہنگیں بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ اس عربی لفظ کا مادّہ 'ن۔ س۔ ب' ہے اور عربی میں 'النّسب' اور 'النّسبہ' کے ایک معنی attribution یعنی منسوب کیے جانے کے بھی ہیں ۲۰۔ اصطلاحاً منسوبات وہ متون ہوتے ہیں جو اصل مصنف کے بجائے کسی اور شخص سے منسوب کر دیے جائیں، خواہ دانستہ خواہ نادانستہ۔

منسوبات ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں تصنیفات اور کلام ہی نہیں بلکہ اشخاص اور اماکن بھی شامل ہیں ۲۱۔ شمس بدایونی نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے لکھا کہ منسوبات میں خیال و نظریہ بھی شامل ہیں نیز شعر بھی ۲۲۔ اردو کے بیسیوں معروف اور زباں زدِ خاص و عام اشعار ایسے ہیں جو اصل شاعر کے بجائے کسی اور سے منسوب کر دیے گئے ہیں اور نیاز فتح پوری، قاضی عبدالودود، عطا کاکوی وغیرہ نے معروف اشعار کے اصل خالق کے بجائے کسی دوسرے شاعر سے غلط انتساب پر (نیز مشہور ہو جانے والے اشعار کے گمنام یا نامعلوم خالقوں پر) آوارہ گرد اشعار کے عنوان سے تحقیق کی ہے ۲۳۔ اشخاص کے ضمن میں منسوبات کی تحقیق کے نتیجے میں بعض اہم حقائق سامنے آئے، مثلاً ولیؔ دو ہیں، جنھیں ایک سمجھ کر ایک کا کلام دوسرے ولی کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا لیکن غلام مصطفی خاں نے بتایا کہ یہ دوسرے ولیؔ اصل میں ولیؔ ویلوری ہیں ۲۴۔

اِلحاق، اِنتحال یا سَرقہ؟

گیان چند نے ایک اصطلاح 'انتحال' استعمال کی ہے ۲۵۔ یہ لفظ اردو کی متداول لغات میں درج نہیں ہے اور نہ ادبی اصطلاحات کی فرہنگوں ہی میں ملتا ہے۔ عربی لفظ انتحال کا مادّہ 'ن۔ ح۔ ل' ہے اور اس کے معنی ہیں کسی کی بات یا کلام کو غلط طور پر اپنی طرف منسوب کرنا ۲۶۔ گیان چند کے مطابق الحاق سے ملتا جلتا مسئلہ انتحال ہے اور اس کے معنی ہیں غلط نسبت اور یہ اصطلاح اس وقت استعمال ہوتی ہے جب کوئی سارق کسی دوسرے کی تخلیق کو اپنی بنا کر پیش کرے ۲۷۔ تنویر احمد علوی کے مطابق الحاق کی ایک صورت سرقہ یا تصرف ہو سکتی ہے ۲۸۔ یہ عاجز

طالب علم عرض کرتا ہے کہ اس کے لیے سرقہ یا چوری کی اصطلاح موجود اور رائج ہے اور مناسب یہی ہو گا کہ اسے انتحال کہنے کے بجائے سیدھے سیدھے سرقہ کہا جائے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ انتحال ایک ایسا الحاق ہے یا منسوبات کی وہ قسم ہے جس کی بنیاد چوری پر ہوتی ہے۔

داخلی اور خارجی شواہد

ادبی تحقیق میں شواہد کی بنیاد پر بعض اہم نکات طے کیے جاتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تحقیق کی بنیاد دلائل اور شواہد ہی ہیں جن کے ذریعے محقق حقائق تک پہنچتا ہے۔ یہ شواہد جعلی متن کا سراغ لگانے اور غلط طور پر منسوب کیے گئے متن کو پہچاننے میں بھی اہم کام کرتے ہیں۔ الحاقی یا جعلی متن یا منسوبات سے ہٹ کر بھی، کسی بھی متن کی صحت اور تدوین کی درستی کے لیے ضروری ہے کہ داخلی شواہد اور خارجی شواہد بھی زیرِ غور لائے جائیں ،خاص طور پر تدوین و تصحیحِ متن میں متن کی صحت اور استناد کی بہت زیادہ اہمیت ہے کیونکہ جس قلمی نسخے یا نسخوں کی بنیاد پر متن کی تصحیح و تدوین و ترتیب کا کام کیا جارہا ہے اگر وہی غیر معتبر ہے تو نہ صرف مرتّبہ و مدوّنہ متن ناقص ہو گا بلکہ اس کی بنیاد پر صادر کیے گئے ادبی فیصلے بھی غلط ہوں گے۔ تدوینِ متن سے پہلے تحقیقِ متن اور تنقیدِ متن میں داخلی اور خارجی شواہد کی بہت اہمیت ہے۔

شواہد کا لفظ جمع ہے ’شاہد‘ کی اور شواہد سے مراد ہے وہ ثبوت یا شہادتیں یا گواہیاں جو کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے دیے جائیں۔ ادبی تحقیق میں شواہد دو طرح کے ہوتے ہیں: داخلی شواہد اور خارجی شواہد۔

داخلی شواہد اور تحقیق و تدوین

مختصر اور آسان ترین الفاظ میں داخلی شواہد سے مراد وہ ثبوت ہیں جو خود مصنف کے متن میں موجود ہیں ۔ادیب یا شاعر نے کیا لکھا، کب لکھا اور کس طرح لکھا، کیسا لکھا، اپنے بارے میں کیا کہا، نادانستہ طور پر اپنے بارے میں کن باتوں کا انکشاف کیا یا اس کی تحریر سے کیا حقائق سامنے آتے ہیں، یہ سب داخلی شواہد ہیں۔ مصنف کا اسلوب ، مخصوص محاورے اور لفظیات، مخصوص تشبیہات و استعارات، املائی تفرّدات اور مختارات، یہ سب بھی داخلی شواہد کا حصہ ہیں۔ مخطوطہ شناسی میں مخطوطے کے متن کے علاوہ اس کے دیباچے اور ترقیمے کی بھی اہمیت ہے [۲۹] یعنی دیباچہ، ترقیمہ، قطعۂ تاریخِ تصنیف بھی داخلی شواہد کا حصہ ہیں۔ ادیب یا شاعر کی اپنی کوئی تحریر خواہ وہ ادبی ہو یا غیر ادبی اور تخلیقی اصناف کے درجے میں ہو یا غیر تخلیقی، رسمی ہو یا غیر رسمی (مثلاً خود نوشت، نجی خطوط، ڈائریاں یا روزنامچے وغیرہ) سب داخلی شواہد میں شامل ہیں۔

داخلی مواد کے سلسلے میں مصنف کی تمام تحریروں کا جائزہ تاریخی ترتیب سے لینا چاہیے یعنی اس کی جو تخلیق یا تحریر سب سے پہلے وجود میں آئی اس کا مطالعہ سب سے پہلے کرنا چاہیے تاکہ اس کے ذہن اور نظریات و خیالات کا تدریجی ارتقا معلوم ہو سکے ۳۰۔ ایک شخص کسی زمانے میں کیسی زبان استعمال کرتا تھا، کیسے محاورے لکھتا تھا، کیا کیا تشبیہات و استعارات، اصنافِ سخن، اور موضوعات اسے پسند (یا ناپسند) تھے، یہ سب داخلی شواہد میں شمار ہوتے ہیں۔ داخلی شواہد سے مصنف یا مخطوطے کے بارے میں کس طرح اہم باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں اس کی ایک جھلک ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب کے ہاں ہے۔ انھوں نے ولی دکنی کے چار اردو اشعار لکھ کر ان کے متن، زبان، مفہوم اور خیالات سے یہ نتائج اخذ کیے ہیں: زبان کی قدامت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کوئی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے، ایک شعر نعتیہ ہے اور اس کا خیال جامیؔ کے ایک فارسی شعر سے ماخوذ ہے گویا فارسی شعرا کی تقلید ہے، ایک شعر میں چاروں خلفاے راشدینؓ کا ذکر ہے جس سے اس کے عقیدے پر روشنی پڑتی ہے، اس کے علاوہ وہ وحدت الشہود کے نظریے کا قائل ہے اور غزل کا شاعر ہے ۳۱۔

داخلی شواہد کی مدد سے منسوبات، جعل اور الحاق کی جیسی تحقیق حافظ محمود شیرانی نے کی ہے ویسی کوئی نہ کر سکا اور شیرانی کے بہت سے تحقیقی کارنامے داخلی شواہد پر ان کی بے مثال گرفت کے عکاس ہیں، مثلاً انھوں نے خارجی اور داخلی شواہد سے ثابت کیا کہ قصۂ چہار درویش امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے ۳۲۔ اس سلسلے میں شیرانی نے جو شواہد پیش کیے ان کا خلاصہ گیان چند نے دیا ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہاں اختصار سے درج کر دیا جائے۔ شیرانی کے پیش کردہ داخلی شواہد وہ یہ ہیں ۳۳:

۱۔ فارسی نسخے میں بعض اشعار ایسے شعرا کے ہیں جو خسرو کے بعد گزرے ہیں، مثلاً: حافظ شیرازی، عرفی اور نظیری۔ ان کے اشعار کا نسخے میں پایا جانا اس کے الحاق یا غلط انتساب کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ قصے میں بعض ایسی اشیا اور عہدے داروں کا ذکر ہے جو مغلیہ دور میں رائج ہوئے اور خسرو کے دور سے پہلے رائج نہیں تھے، مثلاً تومان، اشرفی، خزانہ دار، وکیل السلطنت۔ ظاہر ہے کہ خسرو کے چند صدیوں بعد مغلیہ دور میں رائج ہونے والی اشیاء اور عہدوں کا خسرو کے ہاں پائے جانے کا کیا سوال ہے۔

۳۔ بعض عبارات سے مصنف کا تشیّع ظاہر ہوتا ہے جبکہ خسرو اہلِ تسنّن میں سے تھے۔

۴۔ خسرو کی نثر مرصع اور صنائع بدائع سے پُر ہوتی ہے لیکن اس قصے کا یہ اسلوب نہیں ہے۔

شیرانی نے چہار درویش کی تصنیف خسرو سے منسوب کیے جانے کی تردید کے ضمن میں کچھ خارجی شواہد بھی پیش کیے ہیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

ایک اور مقالے میں محمود شیرانی نے ثابت کیا کہ داستانِ بیژن و منیژہ کو فردوسی نے شاہ نامے سے پہلے کے دور میں تخلیق کیا تھااور اس کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ شاہ نامے کی زبان بہت مختلف ہے اور یہ اس کے زمانی تقدم کی دلیل ہے ۳۴۔ محمود غزنوی کی ایک ہجو فردوسی سے منسوب ہے اور کہا جاتا ہے کہ چونکہ محمود نے فردوسی کو مناسب صلہ نہیں دیا تھالہٰذااس نے محمود کی ہجو لکھی۔ لیکن حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک نہایت عالمانہ مقالے میں اس کا جائزہ لیااور داخلی اور خارجی شواہد سے ثابت کیا کہ وہ ہجو جعلی ہے اور بعد کا اضافہ ہے بلکہ جوں جوں وقت گزرتا گیاان ہجو یہ اشعار کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ۳۵۔ پروفیسر نذیر احمد نے حافظ محمود شیرانی کی عالمانہ تحقیقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''داخلی شہادت حافظ صاحب کی تحقیق کی جان ہے۔ان کا بجا خیال ہے کہ خارجی شہادت اضافی ہوتی ہے۔اس کے برخلاف داخلی شہادت اکثر شبہ [کذا] سے پاک ہوتی ہے''۔۳۶

خارجی شہادت کے اضافی ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا اطلاق دیگر عوامل سے موازنے کی بنیاد پر ہوتا ہے یعنی ایک ہی طرح کی داخلی شہادت ہر معاملے میں اور ہر متن کی تحقیق میں کام نہیں آسکتی۔ حالات وواقعات کے بدلنے سے یاراویوں یا قلمی نسخوں کے باہمی اختلافات سے خارجی شہادت کا درجہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے اور اس کا درست ہونا ہمیشہ یقینی نہیں ہوتا جبکہ داخلی شہادت ٹھوس ہوتی ہے اور اسی متن یا مصنف سے متعلق ہوتی ہے اور اس کے درست ہونے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔

خارجی شواہد اور تحقیق وتدوین

خارجی شواہد میں وہ حالات وواقعات، مضامین و مقالات، کتابیں، تذکرے، تاریخیں شامل ہیں جو کسی شخصیت یا متن کے بارے میں ہیں۔ نیز دوسروں کی لکھی ہوئی یادداشتیں بھی ان میں شامل ہیں ۳۷۔ سوانح عمریاں اور تنقیدی کتابیں، تحقیقی مقالات بھی خارجی شواہد ہوتے ہیں اور لکھنے والے کا ماحول، ثقافتی پس منظر اور عہد بھی خارجی شواہد کا حصہ ہیں۔ جو خطوط عزیزوں یا دوستوں یا اجنبیوں نے مصنف کو لکھے یا کسی غیر متعلقہ شخص کے خطوط یا سوانح یا دوسروں کی خود نوشتیں جن میں مصنف کا ذکر آگیا وہ سب بھی خارجی شواہد میں شامل ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ مصنف کے اپنے متن سے باہر جو چیز ہے وہ خارجی شواہد کا حصہ ہے۔

اگرچہ داخلی شواہد پر بہت زور دیا جاتا ہے اور وہ واقعی بہت اہم ہوتے ہیں لیکن خارجی شواہد کی اہمیت بھی کم نہیں ہوتی۔ خارجی شواہد کے سلسلے میں ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب کو علامہ ڈاکٹر محمد شفیع نے ایک قلمی نسخے کے مطالعے کا مشورہ دیا جو جرمنی میں تھا۔ خاں صاحب نے اس کے مطالعے سے معذوری ظاہر کی تو علامہ صاحب نے کہا کہ ''حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا کے میسر نہ ہونے پر کوئی دوسری دوا تجویز کر سکتا ہے لیکن ریسرچ کے سلسلے میں جو کتاب تجویز کی جائے وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا ہو گی کیونکہ اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے''۳۸۔

خارجی شواہد میں باہمی اختلاف بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے، مثلاً ایک تذکرے میں مصنف کے بارے میں کچھ لکھا ہے اور دوسرے میں کچھ اور۔ یا ایک کتاب میں مصنف کا احوال اس سے الگ ہے جو کسی دوسری کتاب میں ہے۔ خارجی مواد میں اس طرح کے اختلاف جہاں کہیں نظر آئیں انھیں خاص طور پر نوٹ کرنا چاہیے اور معاصر شہادتوں اور داخلی شہادتوں سے اس کی تنقیح کرنی چاہیے ۳۹۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اختلافِ رائے کی وجہ کیا ہے، کسی شخص کو کسی سے بلاوجہ کا حسد یا دشمنی بھی ہوتی ہے اور وہ غلط بیانی سے کام لے سکتا ہے۔ لہٰذا دیکھنا چاہیے کہ اس کے تعلقات کی نوعیت مختلف لوگوں کے ساتھ کیا تھی، اس شخصیت نے اپنے اساتذہ یا معاصرین سے کہاں تک اثرات قبول کیے ہیں اور اپنے معاصرین اور دیگر لوگوں کو کس حد تک متاثر کیا ہے اور اسی سلسلے میں اس شاعر یا ادیب یا شخصیت (جس پر یا جس کے متن پر تحقیق کی جا رہی ہے) کے ماحول کو بھی دیکھنا چاہیے کیونکہ سیاسی، سماجی، معاشی، دینی حالات بھی ذہن کو متاثر کرتے ہیں ۴۰۔ لہٰذا اگر کوئی محقق یا مدوِّن کسی قلمی نسخے کی تدوین کر رہا ہے تو اسے مصنف کے ذاتی حالات اور تاریخی و ثقافتی معاملات پر بھی غور کرنا چاہیے کیونکہ بعض صورتوں میں ان حالات واثرات سے متن اور اس کی صحت کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ یہ گویا خارجی شواہد کی مدد سے داخلی شواہد کی تصدیق ہے۔ مصنف کی کی شخصیت متعین ہو جانے کے بعد اس کی تصنیف اور عہد اور ماحول یعنی زمان و مکان کے تعین کا مرحلہ آتا ہے کہ مخطوطہ کب اور کن حالات میں وجود میں آیا یہ جان لینے سے بہت سی گتھیاں سلجھ جاتی ہے ۴۱۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ خارجی شواہد زیادہ قابلِ قبول نہیں ہوتے اور ان میں عقیدت یا سلف پرستی یا مغالطے کی بنا پر کچھ نتائج قائم کر لیے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر داخلی شواہد کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اس کی ایک مثال حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب کیا گیا دیوان ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے داخلی شواہد سے ثابت کیا کہ یہ دیوان حضرت خواجہ صاحبؒ کا نہیں ہے بلکہ ان کے ایک ہم نام مولانا معین الدین فراہی کا ہے اور اس ضمن میں شیرانی نے بعض خارجی شواہد کو رد کر دیا ہے، مثلاً ایک خارجی شہادت جو بہت ہی کم زور تھی اور جسے شیرانی نے رد کر دیا یہ تھی کہ حضرت خواجہ صاحبؒ ایک صاحب کے خواب میں آئے اور ان کی درخواست پر انھیں ایک نقش

تبرکاً عطا کیا اور پھر ایک کتب فروش خواجہ صاحب کے (مفروضہ) دیوان کو پرانی ردی کتاب سمجھ کر ان کے ہاتھ فروخت کرنے چلا آیا۔اسی طرح بعض تذکروں میں اس دیوان کو حضرت خواجہ صاحبؒ سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن کسی کا خواب میں آنا اور کرامت کے طور پر دیوان کا نسخہ مل جانا یا تذکروں میں دیوان کو کسی سے منسوب کیا جانا ، یہ کم زور خارجی شہادتیں ہیں جن کو شیرانی نے رد کر دیا اور سوال اٹھایا کہ پانچ صدیوں تک یہ دیوان کہاں غائب رہا اور حضرت خواجہ صاحب کے سوانح نگاروں کی نظر سے کیسے بچ گیا[۴۲]۔ صدیوں تک دیوان کا نہ ملنا بھی خارجی شہادت ہے لیکن مضبوط دلیل پر استوار ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحبؒ کی سوانح عمریاں بھی تو خارجی شواہد میں شامل تھیں اور کسی بھی سوانح عمری میں ان کے دیوان کا ذکر نہ ہونا بہر حال ایک مضبوط خارجی شہادت ہے۔ گویا خارجی شہادت بھی مضبوط ہو تو تحقیقِ متن میں صحیح رہنمائی کر سکتی ہے۔

قصہ چہار درویش کے سلسلے میں داخلی شہادتوں کا ذکر اوپر گیان چند کے حوالے سے ہوا ہے۔اس ضمن میں بعض خارجی امور سے بھی شیرانی نے استشہاد کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے تفصیلی سوانح حیات ملتے ہیں لیکن ان میں کہیں ذکر نہیں ہے کہ حضرتؒ بیمار ہوئے تو خسرو نے ان کا دل بہلانے کے لیے یہ قصہ انھیں سنایا۔ دوسرے یہ کہ امیر خسرو کی تصانیف کا ذکر جہاں آیا ہے وہاں بھی اس قصے کا نام نہیں ملتا[۴۳]۔ یہ دونوں بھی خارجی شواہد ہیں اور داخلی شواہد کی توثیق و تائید کرتے ہیں۔

غیر مستند اور مشکوک مآخذ اور ان کے شواہد

غلط انتساب کی بنیاد غیر معتبر یا مشکوک مآخِذ بھی ہوتے ہیں (یاد رہے کہ ماخَذ واحد ہے اور مآخِذ جمع)۔اس طرح کے غیر مستند مآخِذ میں بعض مجہول الاسم یا مجہول الاحوال بیاضیں شامل ہیں۔ مثلاً امیر خسرو سے منسوب وہ مشہور غزل خسرو کی نہیں ہے جس میں ایک مصرع اردو،ہندوی کا ہے اور ایک فارسی کا اور جس کا مطلع ہے :

ز حالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں

اگرچہ جمیل جالبی صاحب نے اسے تاریخِ ادبِ اردو میں امیر خسرو سے منسوب کیا ہے[۴۴] لیکن حافظ محمود شیرانی نے اسے جعفر نامی ایک شاعر کی تخلیق بتایا ہے[۴۵]۔ رشید حسن خاں بھی اسے خسرو کی تخلیق نہیں مانتے کیونکہ اس غلط انتساب کی بنیاد انجمن ترقیِ اردو کی مخزونہ ایک مجہول الاسم بیاض ہے نیز ایک اور بیاض میں یہ غزل کسی اور سے بھی منسوب کی گئی ہے[۴۶]۔ انجمن کی مخزونہ وہ بیاض چونکہ خسرو کی اپنی نہیں ہے اور کسی اور کی ہے لٰہذا یہ بھی

خارجی شہادت ہے اور اس کے کم زور ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے مصنف کا نام اور حالات تک کا علم نہیں ہے ۔ گویا اگر راوی معتبر نہ ہو یا ایسے خارجی متن کا مصنف اور زمانہ معلوم نہ ہو جس میں کسی اور کے متن کا ذکر یا اقتباس ہو تو یہ خارجی شہادت نہایت کم زور ہے۔ متون کی تصدیق کے لیے معاصر یا قریب العہد شہادت زیادہ توقیر رکھتی ہے۔ اگر کسی مشہور و معروف واقعے کی روایات متفق علیہ اور متواتر ہوں اور ان کے پسِ پشت کوئی معتبر شہادت یا قابلِ قبول سند موجود نہ ہو تو وہ روایت تحقیق کے نقطۂ نظر سے ناقابلِ قبول ہے خواہ اس کے پیچھے کتنے ہی ثقہ بزرگ کیوں نہ موجود ہوں۴۷۔ معاصر اور قریب العہد شہادت بے شک مقدم ہے لیکن اس کو بھی مناسب جرح و تعدیل کے بغیر قبول نہیں کرنا چاہیے، چہ جائیکہ مجہول قسم کی بیاضوں یا زبانی روایت اور سنی سنائی باتوں کو تسلیم کر لیا جائے۴۸۔

سنی سنائی باتیں بھی خارجی شواہد ہیں اور انتہائی کم زور۔ سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر جعلی متون بھی پیش کیے گئے لیکن ضروری نہیں کہ غلط انتساب دانستہ کیا گیا ہو یا جعل پر مبنی ہو۔ عقیدت یا حسنِ ظن یا سنی سنائی روایت پر بغیر تحقیق کے یقین کر لینا بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے، جیسا کہ رشید حسن خاں نے لکھا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب بعض ہندی گیت ایک مضمون نگار نے یہ کہہ کر قومی زبان (کراچی) کے شمارہ جولائی ۱۹۶۳ء میں شائع کرائے کہ یہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں اور ''بند سماع''یعنی بند حجرے کی قوالی سے متعلق ہیں جس میں خاص افراد ہی شریک ہو سکتے تھے۴۹۔ پھر رشید صاحب نے لکھا ہے کہ :

> ''سینہ بہ سینہ کی سند مضمون نگار کے لیے تو قابلِ قبول ہو سکتی ہے مگر دوسروں سے اس قدر خوش عقیدگی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک معتبر حوالہ نہ ملے اس وقت تک ان کا انتساب ناقابلِ قبول رہے گا''۵۰۔

یہ سنی سنائی اور سینہ بہ سینہ کی روایت خارجی شہادت ہے اور بے حد کم زور۔

اسی طرح کی ایک مثال ابو سعید ابوالخیر کی رباعیاں ہیں جو دراصل مختلف شعرا کی ہیں اور ان سے عقیدت کی بنا پر عوام نے یہ رباعیاں ان سے منسوب کر دیں جبکہ ان کے انتقال (۴۴۰ ہجری) کے کوئی چھے سو برس بعد تک کوئی تذکرہ نگار ابو سعید ابوالخیر کے شاعر ہونے کا ذکر نہیں کرتا اور اس کے بعد ان سے منسوب رباعیات کا مجموعہ سامنے آیا۵۱۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان رباعیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور قدیم نسخوں میں ان کی تعداد ایک سو تہتر (۱۷۳) تھی جو بیسویں صدی میں بڑھ کر چار سو تینتالیس (۴۴۳) ہو گئی۵۲۔ گویا اول تو کلام

منسوب تھااور پھر اس میں بھی الحاق ہوتا گیا۔کسی تذکرے میں ذکر نہ ملنا خارجی شہادت ہے اور مختلف قلمی نسخوں میں متن میں اضافہ ہوتے جانا داخلی شہادت ہے ، یہاں دونوں قسم کے شواہد اس جعل یا الحاق کو ثابت کرتے ہیں۔

بعض اوقات دنیاوی اور مالی مفادات بھی جعلی متون کی تیاری کا سبب بنتے ہیں۔مثال کے طور پر بہار کی ایک پرانی خانقاہ میں سجادہ نشینی اور تولیت کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اختلاف کی وجہ یہ تھی کی ایک فریق کا کہنا تھا کہ دوسرے فریق کے اعتقادات بانیِ خانقاہ کے عقائد کے خلاف ہیں۔اس پر تمنا عمادی پھلواری نے ، جو تولیت کے دعوے دار تھے، سترھویں صدی کے کتابت کیے ہوئے ایک رسالے کا نسخہ پیش کر دیا جو بظاہر اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے کا تھااور بانیِ خانقاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھااور اس سے ان کے عقائد کی تائید اور دوسرے فریق کے عقائد کی تغلیط ہوتی تھی ۵۳۔اس جعلی متن سے قاضی عبدالودود جیسا جید محقق بھی دھوکا کھا گیا اور انھوں نے اپنے رسالے معیار کے مارچ ۱۹۳۶ء میں اس رسالے کا عکس پیش کر دیا جو کربل کتھا سے بھی قدیم تھااور شمالی ہند میں اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ تھا۔ بعد ازاں انکشاف ہوا کہ وہ جعلی تھااور اپنی سجادہ نشینی کو یقینی بنانے کے لیے ان صاحب نے بہار کی پرانی اردو میں لکھا تھا۔البتہ جس نکتے نے ان کے جعل کو عیاں کیا وہ رسالے میں استعمال کی گئی ایک ترکیب ''زبانِ مادری'' تھی۔یہ انگریزی کی ترکیب مدر ٹنگ (mother tongue) کا فارسی ترجمہ تھا لیکن یہ ترکیب انگریزی دور میں ہندوستان میں رائج ہوئی تھی اور سولھویں یا سترھویں صدی میں اس کے استعمال کا کوئی امکان نہیں تھا ۵۴۔یہ داخلی شہادت تھی جس نے جعل کا بھانڈا پھوڑا۔

رشید حسن خاں نے جمیل جالبی کی 'تاریخِ ادبِ اردو' پر جو سخت تنقید کی ہے اس میں کئی اعتراضات شامل ہیں اور ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ جالبی صاحب نے کسی مجہول الاحوال بیاض کے مندرجات کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے ۵۵۔البتہ گیان چند کا خیال ہے کہ مجہول الاسم بیاضوں کا جائزہ لے کر طے کیا جانا چاہیے کہ ان کا مرتب پڑھا لکھا اور صحیح نویس ہے یا نہیں کیونکہ اگر ہم ان کے اندراجات کو یک سر رد کر دیں تو تاریخِ ادب میں کسی نئے مواد کا اضافہ ہی نہ ہو سکے۔۵۶۔

غیر معتبر راوی اور اس کی شہادت

ماخذ کی طرح راوی بھی غیر معتبر ہو سکتا ہے اور اس سے روایت کیا گیا یا پیش کردہ متن قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔اس لیے اس کی شہادت بھی ناکافی سمجھی جاتی ہے اور ایسے راوی سے استفادہ دیتے وقت یا اس کا حوالہ دیتے

وقت احتیاط کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر رشید حسن خاں بوجوہ بعض راویوں کو غیر معتبر سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں محمد حسین آزاد، صفیر بلگرامی (یہاں 'ف' ہے، صفیر، اس کو بعض لوگ کتابت کی غلطی سمجھ کر 'غ' بنا کر صغیر لکھتے ہیں اور حماقت کرتے ہیں)، شمس اللہ قادری، نصیر حسین خیال اور انتظام اللہ شہابی ہر طرح کی معتبر اور غیر معتبر روایتوں کو درجِ کتاب کر لیتے تھے بلکہ انتظام اللہ شہابی تو روایتیں گھڑنے اور عبارتیں وضع کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا کرتے تھے[۵۷]۔ گیان چند نے ''نہایت غیر معتبر راویوں'' میں شاد عظیم آبادی، صفیر بلگرامی، نصیر حسین خیال، خواجہ عبدالرئوف عشرت لکھنوی، منشی انتظام اللہ شہابی، اور نصیر الدین ہاشمی کو بھی شامل کیا ہے [۵۸]۔ چنانچہ تحقیق اور تدوین کے طالب علموں کو چاہیے کہ احتیاط کریں بلکہ بقولِ گیان چند ان حضرات کے بیانات کو اس وقت تک درست نہ سمجھیں جب تک ان کی تصدیق دیگر مآخذ سے نہ ہو جائے[۵۹]۔

قاضی عبدالودود ہمارے جید ترین محققوں میں شامل ہیں انھوں بھی نصیر حسین خیال پر بہت سخت الفاظ میں تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ کاذب بلکہ کذاب تھے[۶۰] اور نصیر حسین خیال کو مسلمات کے خلاف لکھنے کا بڑا شوق تھا مگر وہ عموماً اپنے دعوے کی کوئی سند پیش کرنے کا تکلف نہیں کرتے اور بعض اوقات تو ایسی بات جس کی تائید میں کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی نہیں ملتی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا تمام مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں[۶۱]۔

چنانچہ مدوِّن اور محقق کو خارجی اور داخلی شواہد نیز مستند متن اور معتبر راوی کی اہمیت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ ضیاء احمد بدایونی، مسالک و منازل (دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۵۵۔

۲۔ ایضاً۔

۳۔ غلام مصطفی خاں، تحقیقی جائزے (کراچی: گاباسنز، سنہ ندارد)، ص ۱۵۔۱۳

۴۔ حافظ محمود شیرانی، مقالاتِ شیرانی، جلد ششم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی) (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۲ء)، ص ۱۷۳۔

۵۔ خلیق انجم، متنی تنقید (کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۷۸۔

۶۔ حافظ محمود شیرانی، مقالاتِ شیرانی، جلد ششم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی)، محولہٗ بالا، ص ۱۷۳۔

۷۔　غلام مصطفی خاں، دیوانِ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، مشمولہ تحقیق، شمارہ ۱۱۔۱۰، مئی۱۹۹۸ء، سندھ یونیورسٹی جام شورو، ص۳۶۲۔۳۵۹

۸۔　اردو لغت(تاریخی اصول پر)، جلد اول(کراچی: اردو لغت بورڈ،۱۹۷۷ء)۔

۹۔　فرہنگِ تلفظ(مرتبہ شان الحق حقی)(اسلام آباد: ادارۂ فروغِ قومی زبان،۲۰۲۲ء)۔

۱۰۔　گیان چند جین، تحقیق کا فن(اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان،۱۹۹۴ء)، ص۵۴۷(اشاعتِ اول)۔

۱۱۔　گوپی چند نارنگ ،امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر (لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۰ء)،ص۲۹۔۲۸،۲۲۔۳۲۔۳۲

۱۲۔　ایضاً،ص۳۲۔

۱۳۔　وحید مرزا،امیر خسرو: سوانح عمری(دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۲۰۱۵ء)،ص۱۴۹(اشاعتِ نو)۔

۱۴۔　گیان چند جین، کھڑی بولی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصہ ،مشمولہ خسرو شناسی (مرتبہ ظ۔انصاری و ابوالفیض سحر)، (دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۸ء)، ص ۲۲۳۔ ۲۲۲(تیسرا ایڈیشن)۔

۱۵۔　ایضاً،ص۲۱۱۔

۱۶۔　دیکھیے نارنگ صاحب کی کتاب: امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر، محولہ بالا۔

۱۷۔　تحقیق و تدوین: مسائل اور مباحث(ملتان: بیکن بکس،۲۰۱۲ء)،ص۵۰۔

۱۸۔　اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۸(کراچی: اردو لغت بورڈ،۲۰۰۲ء)؛ نیز علمی اردو لغت (مرتبہ وارث سرہندی)(لاہور: علمی کتب خانہ،۲۰۰۳ء)۔

۱۹۔　اردو لغت(تاریخی اصول پر) جلد اول(کراچی: اردو لغت بورڈ،۱۹۷۷ء)۔

۲۰۔　معجم المصطلحات العربیہ فی اللغۃ والادب(عربی)(مرتبہ مجدی وہبہ اور کامل المہندس)(بیروت : مکتبہ لبنان،۱۹۸۴ء)؛ نیز قاموس المصطلحات اللغویّۃ والادبیّۃ (عربی، انگلیزی، فرنسی)(مرتبہ امیل یعقوب، بسّام برکہ اور میی شیخانی)(بیروت: دار العلم للملایین،۱۹۸۷ء)۔

۲۱۔　نجم الاسلام ، کچھ منسوبات کچھ تحقیقِ منسوبات کے بارے میں، مشمولہ تحقیق ، شمارہ ۱۱۔۱۰، مئی ۱۹۹۸ء، جام شورو، ص۴۹۱۔

۲۲۔　یہ کس کا شعر ہے؟ عالمی اردو ادب، دہلی، شمارہ ۲۲۔۲۰۰۴ء، ص۲۰۴۔

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ نجم الاسلام ، کچھ منسوبات کچھ تحقیقِ منسوبات کے بارے میں، مشمولہ تحقیق ، شمارہ ۱۱۔۱۰، مئی ۱۹۹۸ء، جام شورو، ص ۴۹۲۔۴۹۱

۲۵۔ گیان چند جین، تحقیق کا فن (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء) ص ۴۴۳ (طبعِ اول)۔

۲۶۔) Dictionary A Comprehensive Persian-English مرتبہ ایف اسٹین گاس .F) Steingass لاہور: سنگ میل ۲۰۰۰ء)، عکسی طباعت، اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء(۔

۲۷۔ گیان چند، تحقیق کا فن، محولہ بالا، ص ۴۴۳۔

۲۸۔ اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن (دہلی: ایجو کیسنل پبلشنگ، ۱۹۹۴ء)، ص ۸۳۔

۲۹۔ ضیاءاحمد بدایونی، مسالک و منازل، محولہ بالا، ص ۱۵۶۔

۳۰۔ غلام مصطفی خاں، تحقیقی جائزے، محولہ بالا، ص ۱۹۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۲۲۔۲۱

۳۲۔ دیکھیے شیرانی کا مقالہ قصہٗ چہار درویش مشمولہ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد نہم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی)، (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۳۹۔۱۱۳

۳۳۔ دیکھیے گیان چند کا مقالہ محمود شیرانی مرحوم سے میرے استفادات، مشمولہ ارمغانِ شیرانی (مرتبہ رفیع الدین ہاشمی و زاہد منیر عامر) (لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۰۲ء)، ص ۳۳۔۳۲

۳۴۔ پروفیسر نذیر احمد، فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات، مشمولہ سہ ماہی اردو، اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۸۰ء، ص ۴۴۔

۳۵۔ بحوالہ ایضاً، ص ۴۷۔۴۶

۳۶۔ پروفیسر نذیر احمد، مقالہ مشمولہ سہ ماہی اردو، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۰ء، محولہ بالا، ص ۴۴۔

۳۷۔ ضیاءاحمد بدایونی، مسالک و منازل، محولہ بالا، ص ۱۵۶۔

۳۸۔ تحقیقی جائزے، محولہ بالا، ص ۱۸۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۷

۴۰۔ ایضاً۔

۴۱۔ ضیاءاحمد بدایونی، مسالک و منازل، محولہ بالا، ص ۱۵۶۔

۴۲۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی ، جلد ششم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی)(لاہور مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۷۲ء)، ص۱۹۴۔۱۷۱

۴۳۔ دیکھیے گیان چند کا مقالہ مشمولہ ارمغانِ شیرانی، محولہَ بالا، ص۳۳۔۳۲

۴۴۔ جالبی، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اول (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۸۴ء)، ص۲۸ (طبعِ دوم)۔

۴۵۔ مقالات حافظ محمودِ شیرانی، جلد سوم (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۲ء)، ص۵۳۔

۴۶۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ (علی گڑھ: ایجو کیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء)، ص۲۴۔

۴۷۔ حنیف نقوی، تحقیق وتدوین؛ مسائل و مباحث، محولہَ بالا، ص۵۰۔

۴۸۔ ایضاً۔ ص۵۱۔

۴۹۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، محولہَ بالا، ص۳۱۔

۵۰۔ ایضاً۔

۵۱۔ خلیق انجم، متنی تنقید (کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۰۶ء)، ص۱۷۸۔

۵۲۔ ایضاً۔

۵۳۔ مالک رام، تحقیقی مضامین (دہلی: مکتبہَ جامعہ، ۱۹۸۴ء)، ص۲۴۹۔

۵۴۔ ایضاً، ص۲۵۰۔۲۴۹

۵۵۔ رشید حسن خاں، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، محولہَ بالا، ص۳۰۴، ۳۰۵۔

۵۶۔ تحقیق کا فن، محولہَ بالا، ص۱۹۴۔

۵۷۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، محولہَ بالا، ص۱۷۔

۵۸۔ تحقیق کا فن، محولہَ بالا، ص۱۹۴۔

۵۹۔ ایضاً۔

۶۰۔ تحقیقاتِ ودود: متفرقات (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء)، ص۱۸۹۔

۶۱۔ ایضاً، ص۱۲۴ و بعدہٗ۔

کتابیات

(الف) عمومی کتب و مقالات

۱۔ احمد، پروفیسر نذیر، فارسی زبان و ادب سے متعلق پروفیسر حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات، مشمولہ سہ ماہی اردو، اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۸۰ء۔

۲۔ انجم، خلیق، متنی تنقید، کراچی: انجمن ترقیِ اردو، ۲۰۰۶ء۔

۳۔ بدایونی، شمس، یہ کس کا شعر ہے؟ مشمولہ عالمی اردو ادب (دہلی) شمارہ ۲۲، ۲۰۰۴ء۔

۴۔ بدایونی، ضیا احمد، مسالک و منازل، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۲۰۱۱ء۔

۵۔ جالبی، جمیل، تاریخِ ادبِ اردو، جلد اول، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۸۴ء (طبعِ دوم)۔

۶۔ جین، گیان چند، تحقیق کا فن، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء (طبعِ اول)۔

۷۔ جین، گیان چند، کھڑی بولی کے ارتقا میں امیر خسرو کا حصہ، مشمولہ خسرو شناسی (مرتبہ ظ۔ انصاری و ابو لفیض سحر)، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۸۸ء (تیسرا ایڈیشن)۔

۸۔ جین، گیان چند، محمود شیرانی مرحوم سے میرے استفادات، مشمولہ ارمغانِ شیرانی (مرتبہ رفیع الدین ہاشمی و زاہد منیر عامر)، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۲۰۰۲ء۔

۹۔ خاں، رشید حسن، ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء۔

۱۰۔ خاں، غلام مصطفی، تحقیقی جائزے، کراچی: گاباسنز، سنہ ندارد۔

۱۱۔ خاں، غلام مصطفی، دیوانِ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ، مشمولہ تحقیق، شمارہ ۱۱۔۱۰، مئی ۱۹۹۸ء، سندھ یونیورسٹی جام شورو۔

۱۲۔ رام، مالک رام، تحقیقی مضامین، دہلی: مکتبۂ جامعہ، ۱۹۸۴ء۔

۱۳۔ شیرانی، حافظ محمود، مقالات حافظ محمودِ شیرانی، جلد سوم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۲۰۰۲ء۔

۱۴۔ شیرانی، حافظ محمود، مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد ششم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۲ء۔

۱۵۔ شیرانی، حافظ محمود، مقالاتِ حافظ محمود شیرانی، جلد نہم (مرتبہ مظہر محمود شیرانی)، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۹ء۔
۱۶۔ عبدالودود، قاضی، تحقیقاتِ ودود: متفرقات، پٹنہ: خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۵ء۔
۱۷۔ علوی، تنویر احمد، اصولِ تحقیق و ترتیبِ متن، دہلی: ایجوکیسنل پبلشنگ، ۱۹۹۴ء۔
۱۸۔ مرزا، وحید، امیر خسرو: سوانح عمری، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء (اشاعتِ نو)۔
۱۹۔ نارنگ، گوپی چند، امیر خسرو کا ہندوی کلام مع نسخۂ برلن ذخیرۂ اشپرنگر، لاہور: سنگِ میل، ۱۹۹۰ء۔
۲۰۔ نجم الاسلام، کچھ منسوبات کچھ تحقیقِ منسوبات کے بارے میں، مشمولہ تحقیق، شمارہ ۱۱۔۱۰، مئی ۱۹۹۸ء، جام شورو۔
۲۱۔ نقوی، حنیف، تحقیق و تدوین: مسائل اور مباحث، ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۲ء۔